E-Content

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India

Subject / Course - M.A. Urdu

Paper : 03 – Urdu Zaban o Adab Ki Tareekh

Module Name/Title : Bahmani Daur Mein Urdu Adab

DEVELOPMENT TEAM	
CONTENT	DDE, MANUU / Dr. Nikhat Jahan
PRESENTATION	Dr. Nikhat Jahan
PRODUCER	Md. Mujahid Ali

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India
//imcmanuu

اکائی : 8 بہمنی دور میں اُردو ادب

ساخت

8.1 تمہید
8.2 بہمنی دور کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر
8.3 بہمنی دور میں اردو کے فروغ کے اسباب
8.4 ابتدائی زمانہ
8.5 بہمنی دور کے علمی اور ادبی کارنامے
8.6 میراں جی شمس العشاق
8.7 سید اشرف شاہ بیابانی
8.8 دیگر شعرا
8.9 خلاصہ
8.10 نمونہ امتحانی سوالات
8.11 فرہنگ
8.12 سفارش کردہ کتابیں

8.1 تمہید

اردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی۔ محمود غزنوی اور محمد غوری نے پنجاب میں اپنی حکومتیں قائم کیں تو اردو کی ابتدا کی صورت پیدا ہوئی۔ محمد غوری نے دہلی پر قبضہ کر کے جب قطب الدین ایبک کو وہاں کا حاکم بنادیا تو مستقل طور پر فارسی اور ترکی بولنے والے آباد ہو گئے۔ مقامی زبانیں الگ تھیں۔ مقامی زبانوں میں جب دوسری زبانوں یعنی فارسی اور کچھ عربی اور ترکی کے بعض الفاظ شامل ہونے لگے اور ایک نئی زبان کی صورت پیدا ہوئی۔ اس کو ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ جس طرح حیدرآباد کی ہر چیز کو حیدرآبادی کہا جاتا ہے اور عرب کی ہر چیز کو عربی کہا جاتا ہے۔ ہند کی مناسبت سے ہند یا یعنی ہندوستان کی ہر چیز کو ہندی کہا جاتا تھا اور اب بھی کہا جاتا ہے جیسے عرب میں ہندوستانیوں کو ''الہندی'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو بھی مدتوں تک ہندی یا ہندوی کہلائی۔ دہلی میں جب یہ پھلنے پھولنے لگی تو ''زبان دہلوی'' کے نام سے یاد کی گئی۔ علاء الدین خلجی کی فوجوں کے ساتھ جب گجرات پہنچی تو گجری کہلائی۔ خلجی اور تغلقی فوجیوں کی زبان پر چڑھ کر جب دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ ولی کی سخن وری کی داد دیتی ہوئی اس کے ساتھ جب دوبارہ دلی پہنچتی ہے تو ''ریختہ'' کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ شاہی لشکر میں جب وہ رہنے لگی تو ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

بہمنی دور میں وہ صرف بول چال کی زبان نہیں رہی بلکہ ادب کے اونچے درجے پر فائز ہوئی۔

8.2 بہمنی دور کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر

اردو زبان کا آغاز شمالی ہند میں ہوا۔ وہاں دو تین سو سال تک نشوونما پانے کے بعد اس نے دکن کا رخ کیا۔ سیاسی حالات و واقعات کی

وجہ سے وہ دکن پہنچی ۔ علاء الدین خلجی کی سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے اردو زبان کو دکن میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا ۔ علاء الدین 1297ء میں گجرات کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا۔ گجرات کوئی سو سال تک سلطنت دہلی کا حصہ بنا رہا۔ گجرات فتح کرنے کے بعد 1310ء میں علاء الدین نے دکن اور مالوہ پر حملہ کر کے انھیں بھی فتح کرلیا۔ چونکہ یہ علاقے دہلی سے کافی دور تھے اس لیے یہاں موثر طور پر حکمرانی کرنے کے لیے گجرات' دکن اور مالوہ کے علاقوں کو علاء الدین نے سوسومواضعات میں تقسیم کردیا اور ہر موضع پر ایک ایک افسر مقرر کردیا جو ''امیر صدّہ'' کہلاتا تھا۔ امیرانِ صدہ یہاں کے بے تاج بادشاہ ہوا کرتے تھے ۔ مال گزاری وصول کرنے سے لے کر یہاں کا ہر چھوٹا بڑا انتظام ان ہی کے سپرد ہوتا تھا۔ چونکہ انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے انھیں مستقل طور پر یہیں رہنا ہوتا تھا اس لیے وہ اپنے اہل وعیال اور متعلقین کو بھی ساتھ لے آئے تھے ۔ دکن اور گجرات ہی کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا تھا۔

امیران صدّہ دکن آنے سے پہلے شمالی ہند میں آباد تھے اور وہاں ان کے آباواجداد صدیوں سے بسے ہوئے تھے اور اس لیے دربار اور سرکار سے ہٹ کر اردو یا ہندوی ہی سے اپنا کام نکالتے تھے ۔ جب گجرات اور دکن میں انھوں نے سکونت اختیار کرلی تو اسی زبان سے اپنا روزمرہ کا کام نکالنے لگے ۔ یہی زبان رابطے کی زبان بن گئی تھی ۔ بعد کے حالات نے اس صورتِ حال کو اور زیادہ مستحکم کردیا۔ خلجی کے بعد محمد تغلق نے امیرانِ صدّہ کے اس نظام کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کو اور مضبوط بنانے کے لیے احکام صادر کیے ۔ اس نظام کی وجہ سے اردو زبان کو جو فائدہ حاصل ہوا اس کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں :

> ''اس نظام کی وجہ سے شمال کے لیے دکن اور گجرات کے راستے کھلے رہے ۔ تجارت' لین دین اور دوسرے معاشرتی امور مضبوط تر ہوتے رہے اور ساتھ ساتھ اردو زبان کا حلقہ اثر بھی بڑھتا اور پھیلتا رہا اور ان علاقوں میں یہ زبان بین الاقوامی زبان کی حیثیت میں پھلتی پھولتی رہی ۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب بول چال کی زبان سے گزر کر ادبی سطح پر استعمال میں آئی اور صوفیوں' شاعروں نے اسے اپنے اظہار مقصد کا ذریعہ بنایا تو گجرات میں اس کے ادبی روپ کو ''گجری'' نام دیا گیا اور دکن میں یہ دکنی کہلائی''
> (تاریخِ ادب اردو ۔صفحہ ۱۳)

محمد تغلق کے ایک اور تاریخی اقدام نے اردو کو دکن میں مستحکم کرنے میں بڑا اہم حصہ ادا کیا۔ دہلی سے دکن کی دوری کا اندازہ خلجی کو بھی تھا' اسی وجہ سے اس نے امیران صدہ کو مقرر کیا تھا۔ محمد تغلق انتہا پسند بادشاہ تھا۔ اس نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ خود امیرانِ صدہ بھی اس کے قابو سے نکل سکتے ہیں۔ دکن پر اپنی گرفت کو مضبوط ترین بنانے کے لیے اس نے خود پائے تخت کو دہلی سے دولت آباد منتقل کردیا اور اس انتقال مکانی پر اس انتہا پسندی سے کام لیا کہ دہلی میں ایک متنفس بھی نہیں رہا۔ اس طرح 1327ء میں دہلی کی ساری آبادی دولت آباد منتقل ہوگئی ۔ اس سارے عمل سے دکنی زبان کو اور قوت سے ساتھ پھلنے پھولنے اور فروغ پانے کا موقع مل گیا۔ بعد میں تغلق نے دکن سے پھر دہلی کو پائے تخت بنایا تو بے شمار لوگ دکن ہی میں رہ گئے ۔ اور امیرانِ صدہ کے زیر سایہ آگئے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیران صدہ زیادہ طاقتور ہوگئے ۔ اسی لیے محمد تغلق کے آخری زمانے میں تمام امیران صدہ نے متحد ہوکر بغاوت کردی اور خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اور اپنے میں سے ایک کو بادشاہ بنادیا۔ 1347ء میں یوں عظیم الشان بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑی ۔ بہمنی حکومت میں دکنی زبان کے فروغ اور دکنی کلچر کی ابتدا کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں :

> ''اب دکن کی سلطنت شمال سے آئے ہوئے ان ترک خاندانوں کے ہاتھ میں آگئی تھی جو خود کو دکنی کہنے پر فخر محسوس کرتے تھے ۔ دکنی ان کی زبان تھی جس پر انھوں نے دکنی قومیت اور کلچر کی بنیاد رکھی تھی ۔ بہمنی سلطنت کی زبان خافی خان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے' ہندوی تھی'' (تاریخ ادب اردو' صفحہ 14)

بہمنی خاندان کا پہلا بادشاہ علاء الدین حسن شاہ بہمنی تھا۔ بہمنی عہدِ حکومت 1350ء سے شروع ہوکر 1525ء کو ختم ہوتا ہے ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو دکن میں کس طرح پہنچی ؟
2. امیران صدہ اور محمد تغلق کی وجہ سے اردو زبان کو دکن پر کس طرح فروغ حاصل ہوا ؟

8.3 بہمنی دور میں اردو کے فروغ کے اسباب

بہمنی عہد میں اردو زبان اور ادب کو جو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس کے کئی اسباب تھے ۔قدیم اردو یا دکنی جو رابطے کی زبان بنی اس کی سب سے اہم اور بڑی وجہ یہ تھی کہ دکن میں دراوڑی خاندان کی زبانیں کئی تھیں جیسے تلگو' کنڑی' ملیالم اور تامل ۔ یہ زبانیں ہند آریائی زبانوں سے اتنی الگ اور مختلف تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی زبان بنیادی زبان نہیں بن سکتی تھی ۔ اسی وجہ سے قدیم اردو جس کو بولتے ہوئے خلجی اور تغلق کے زمانے میں دکن کے حاکم مقرر ہوئے انھوں نے اسی کو رابطے کی زبان بنایا۔ اس کے علاوہ قدیم اردو یعنی دکنی کو جو سرکاری اور درباری سرپرستی حاصل ہوئی اس کا اہم سبب سیاسی تھا۔ جب کبھی کوئی ملک اور قوم آزادی حاصل کرتی ہے اور خود مختار ہوتی ہے ۔اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے حاکم ملک اور قوم سے ہر لحاظ سے خود مختار ہو اور الگ ہو۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنی الگ پہچان اور شناخت بنانے کی کوشش کرتی ہے ۔اس بات کی سب سے بڑی اور روشن مثال امریکا ہے۔ امریکا پر برطانیہ اس طرح قابض تھا جس طرح ہندوستان پر تھا۔ امریکا جب برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہوا تو اس نے جہاں اپنا جھنڈا اور سکہ علحدہ کیا وہیں انگریزی کو قائم رکھتے ہوئے اس کا لہجہ الگ اور مختلف کرلیا اسی طرح املا میں بھی کئی تبدیلیاں کیں اور برطانوی انگریزی سے اسے ممتاز اور الگ کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح سے آمدورفت کے برطانیہ سے بالکل برعکس اصول اور ضابطے اختیار کیے۔ برطانیہ میں اور دوسرے بہت سے ممالک میں بائیں طرف سے چلنا ضروری ہوتا ہے ۔ لیکن امریکا میں دائیں جانب سے چلنے کا اصول اختیار کیا گیا۔ بجلی کے کھٹکے برطانیہ میں جب نیچے کی طرف کیے جاتے ہیں تو بجلی چالو ہوتی ہے۔ لیکن امریکہ میں جب کھٹکے اوپر کی جانب کیے جاتے ہیں تو بجلی چالو ہوتی ہے ۔اس طرح آزاد ملک اپنی پہچان اور شناخت بناتے ہیں بالکل اسی طرح بہمنی سلطنت نے بھی اپنی شناخت بنانے کے لیے مغلیہ سلطنت سے اختلاف کیا۔ جہاں جھنڈا اور سکہ لازمی طور پر الگ ہوئے اور دوسری بہت سی چیزوں میں اختلاف ہوا وہیں زبان کے سلسلے میں بھی مغلیہ سلطنت سے بہمنی سلطنت نے اپنے آپ کو الگ کیا۔ مغلیہ سلطنت میں فارسی نہ صرف سرکاری اور درباری زبان تھی بلکہ علمی اور ادبی اغراض کے لیے بھی صرف فارسی ہی استعمال ہوتی تھی ۔ حد یہ کہ اردو کے بڑے سے بڑا شاعر بھی شاعری کے سوا جب کوئی علمی اور ادبی کام انجام دیتا تھا تو وہ فارسی ہی استعمال کرتا تھا۔ میر' مصحفی' میر حسن قائم چاند پوری اور اس زمانے کے تمام دوسرے شاعر جب اردو شاعروں کا تذکرہ لکھتے تھے تو فارسی ہی میں لکھتے تھے ۔بہمنی عہد میں قدیم اردو یا دکنی پر زیادہ توجہ دی گئی اور کئی اہم دکنی شاعر اس دور میں ملتے ہیں ۔

بہمنی دور میں جو ''نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات'' قائم ہوئیں اس کے تعلق سے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں :

> 1347 ء میں علاء الدین حسن بہمن شاہ نے خود مختار حکومت قائم کرلی ۔ پہلے پہل اس کا پایہ تخت دولت آباد تھا لیکن جلد ہی اس نے گلبرگہ پائے تخت بنایا اور اس کا نام حسن آباد رکھا۔ بہمنی خاندان کے کل اٹھارہ حکمران ہوئے ۔ ان میں بڑے قابل اور علم دوست بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے دکن میں نئی تہذیبی روایات کو ترقی دی اور نئی ادبی اور لسانی روایات کی بنیاد رکھی'' (اردو کی ادبی تاریخ صفحہ 68)

علاء الدین خلجی کے دکن فتح کرنے سے پہلے بھی کئی بزرگ دکن آئے تھے جنہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ ''نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات'' کو فروغ دینے میں بڑا حصہ ادا کیا۔ دکن میں خلجی کے آنے سے پہلے جن بزرگوں کے نام ملتے ہیں ان میں حاجی رومی' سید شاہ مومن' بابا سید مظہر عالم' شاہ جلال الدین گنج رواں' سید احمد کبیر حیات قلندر' بابا شرف الدین' بابا اور شہاب الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاء

الدین خلجی کی فتح دکن کے بعد جو بزرگ دکن آئے اور جنہوں نے ایک نئی زبان کو یہاں ترویج دینے میں اہم کام انجام دیا ان کے تعلق سے جمیل جالبی لکھتے ہیں :

> ''علاء الدین کی فتح دکن کے بعد روحانی پیشوائی کے اس سلسلے کو اور فروغ حاصل ہوا اور یہاں بھی پیر مقصود' پیر جمنا' شاہ منتخب الدین زرزری بخش میر مٹھے حضرت گیسو دراز کے والد سید یوسف شاہ راجو قتال شاہ برہان الدین غریب' شیخ ضیاء الدین اور بہت سے دوسرے صوفیائے کرام دکن کے مختلف علاقوں میں سجادے بچھاے ۔ درس' اخلاق و تبلیغ دین میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان بزرگوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کے الفاظ شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولا تیار کیا جس سے اظہار کی مشکل حل ہوگئی ۔ اردو زبان کی ابتدائی ترقی میں ان لوگوں کی نامعلوم کوششیں ناقابل فراموش ہیں'' (تاریخ ادب اردو ' صفحہ 151)

بزرگانِ دین کے ملفوظات جو ہم تک پہنچے ہیں ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر ہندوستانی زبانوں کے مختلف اثرات پڑ رہے تھے۔ ان کی زبان کو کسی ایک زبان تک محدود نہیں کیا جاسکتا ۔جمیل جالبی نے شاہ برہان الدین غریب' زین الدین خلد آبادی' شاہ کو چک ولی کے ملفوظات کے بارے میں کہا ہے :

> ''یہ جملے نہ خالص پنجابی ہیں اور نہ خالص سندھی' سرائیکی یا اردو میں' مختلف زبانوں کے اثرات ان میں ملے جلے نظر آرہے ہیں''۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. بہمنی حکومت کے قیام سے اردو کو کیا فائدہ پہنچا؟
2. بزرگان دین اور صوفیائے کرام کی دکن میں آمد سے اردو کو کیا فائدہ پہنچا؟

8.4 ابتدائی زمانہ

بہمنی عہد کا ابتدائی زمانہ یعنی علاء الدین حسن بہمن شاہ کا زمانہ زیادہ تر اپنی حکومت کو مستحکم بنانے میں گزرا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے زمانے میں کئی علما و فضلا کو پایۂ تخت میں مدعو کیا گیا ۔ علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ اول تخت نشین ہوا ۔ اس نے بہمنی سلطنت کو پُرشکوہ بنانے میں بڑا کام کیا۔ بہمنی دربار کی شان وشوکت اسی کے زمانے میں قائم ہوئی ۔محمد شاہ کے زمانے میں کئی روحانی پیشوا' صوفیا اور بزرگ گلبرگہ میں تھے۔ وہ جس طرح عوام کی اصلاح کرتے تھے اور بادشاہ کو بھی راہ راست دکھاتے تھے اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کرتے تھے۔ اس کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سہروردی لکھتے ہیں :

> ''عوام حتیٰ کہ بادشاہوں کے اخلاق و عادات پر نظر رکھتے اور جب ضرورت پڑتی اس کی اصلاح کی کوشش کرے ۔ حضرت زین الدین کے کہنے سے محمد شاہ نے شراب پینا چھوڑ دیا تھا اور حدود سلطنت میں شراب کی دکانیں بند کرادی تھیں ۔ حضرت زین الدین کا کام بھی عوام کو ارشاد و ہدایت کرنا تھا اور وہ دکن کے لوگوں کو پرانی اردو ہی میں احکام دین سمجھاتے تھے ۔ (اردو کی ادبی تاریخ صفحہ 70)

محمد شاہ کے زمانے میں حضرت عین الدین گنج العلم کا انتقال ہوا۔ وہ بیجاپور چلے گئے تھے انھوں نے دکنی عوام کی ہدایت اور اصلاح کے لیے کچھ رسالے دکنی میں لکھے تھے۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا مجاہد شاہ اور اس کے بعد علاء الدین کا دوسرا بیٹا داؤد شاہ تخت نشین ہوئے ۔ اس زمانے میں امراء کی کشمکش

کی وجہ سے سلطنت کا سکون متاثر ہوگیا تھا۔ بعد میں محمد شاہ ثانی جب تخت نشین ہوا تو شورشیں کم ہوگئیں اور سکون بحال ہوا۔ محمد شاہ ثانی نے بھی علما اور شعرا کو اپنے دربار میں مدعو کیا۔ فارسی کے شہرہ آفاق شاعر حافظ کو بھی محمد شاہ نے مدعو کیا تھا۔ لیکن وہ نہیں آئے۔ محمد شاہ خود بھی فارسی کا شاعر تھا۔ محمد شاہ کے انتقال کے بعد پھر سلطنت میں بے چینی پیدا ہوگئی اور اقتدار کے لیے رسا کشی شروع ہوگئی۔ جس کی وجہ سے ایک سال کے اندر دو بادشاہ غیاث الدین اور شمس الدین تخت پر بیٹھائے بھی گئے اور اتارے بھی گئے۔ البتہ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے بعد یہ ہنگامے ختم ہوگئے۔ فیروز شاہ بہمنی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا اس کے عہد میں سلطنت اپنی تہذیب، علم وفن اور شان وشوکت کے اعتبار سے عروج پر پہنچ گئی۔ فیروز شاہ علم و ادب کی دل سے قدر کرتا تھا اس لیے اس کے دربار میں علما وصوفیا جمع تھے۔ فیروز شاہ کے عہد کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ حضرت محمد حسینی گیسودراز گلبرگہ میں رونق افروز ہوئے۔ آپ نے یہاں بھی رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ فارسی کے ساتھ کبھی کبھی اردو میں بھی درس دیا کرتے تھے۔ آپ سے کئی تصانیف اردو کی منسوب کی جاتی ہیں۔ ''معراج العاشقین'' بھی آپ سے منسوب کی جاتی تھی لیکن بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ آپ کی تصنیف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ''شکار نامہ''، ''تمثیل نامہ''، ''خلاصہ توحید'' اور ''تلاوت الوجود'' آپ کے نام سے منسوب ہیں۔ آپ نے عورتوں کے لیے بھی ایک چھوٹی سی نظم ''چکی نامہ'' لکھی تھی۔ آپ کے بڑے فرزند جن کا انتقال آپ کی زندگی میں ہوگیا تھا، دکنی کے شاعر تھے۔ آپ کا نام محمد اکبر حسینی تھا۔

آپ نے ایک مختصر سا رسالہ دکنی میں لکھا تھا۔ اس میں بھی وعظ اور نصیحت ملتی ہے۔

فیروز شاہ کے بعد احمد شاہ تخت نشیں ہوا۔ اس کو بھی بزرگان دین پر اعتقاد تھا اور ان کے ساتھ بے حد عزت اور احترام سے پیش آتا تھا۔ فیروز شاہ کے بعد احمد خاں بہمنی سلطنت کے تاج وتخت کا وارث بنا۔ اس نے اپنا پایہ تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل کیا۔ بیدر میں جو اس نے عالی شان محل اور عمارتیں بنائی تھیں وہ فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ اس کے زمانے میں کئی ایرانی شاعر بیدر کے دربار میں آئے۔ فارسی کے شاعر آذری کو احمد شاہ نے ملک الشعرا بنایا تھا۔ آذری دکنی میں بھی شاعری کرتا تھا اور اس نے ''بہمن نامہ'' کے نام سے بہمنی سلاطین کی منظوم تاریخ لکھی تھی۔

احمد شاہ کا جانشین علاء الدین ثانی تھا۔ اس کے عہد میں کئی علما اور فضلا موجود تھے۔ حضرت گیسودراز کا اسی کے عہد میں انتقال ہوا۔ اس کے دور میں علمی اور فنی ترقی جاری رہی۔ اس نے قمار بازی اور مئے نوشی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ علاء الدین ثانی کے بعد ہمایوں شاہ، جسے ظالم کا لقب ملا تھا تخت نشیں ہوا۔ جو علما ہمایوں کے تخت نشیں ہونے کے مخالف تھے، جب ہمایوں تخت وتاج حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو ان کو چن چن کر قتل کرنے لگا۔ اس کے باوجود اس کے عہد میں کئی عالم اور شاعر رہے ہیں۔ شاہ طاہر استرآبادی اور ملا محمد تقی نظیری اس کے زمانے کے فارسی کے مشہور شاعر گزرے۔ نظیری دکنی بھی شعر کہتا تھا۔ محمود گاواں تجارت کی غرض سے بیدر آئے۔ ہمایوں اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسے اپنے لشکر کا سالار بنادیا۔ ہمایوں کے بعد اس کا آٹھ سالہ بیٹا احمد شاہ ثالث تخت نشین ہوا۔ لیکن سلطنت کا کاروبار اس کی والدہ ماجدہ نے سنبھال لیا۔ اس خاتون نے بڑی قابلیت کے ساتھ سلطنت پر حکمرانی کی۔ احمد شاہ کے بعد محمد شاہ لشکری نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کے عہد حکومت میں محمود گاواں نے بہت عروج حاصل کیا۔ اس نے علما وفضلا کی سرپرستی کی۔ ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا جو آج بھی بیدر میں موجود ہے۔ اس مدرسہ کا ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا۔ محمد شاہ نے یوسف عادل خاں کو سپہ سالار بنادیا تھا۔ جس نے بعد میں عادل شاہی حکومت قائم کی۔ بعد میں باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو آفاقی کہا جانے لگا۔ جب آفاقیوں اور دکنیوں میں پُر تشدد جھگڑے شروع ہوئے تو ان جھگڑوں میں محمود گاواں کو قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد محمد شاہ لشکری کا انتقال ہوا۔ محمد شاہ بہمنی سلطنت کا آخری عظیم الشان بادشاہ تھا۔ محمد شاہ کے عہد حکومت میں اردو کی قدیم ترین مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' لکھی گئی۔ محمد شاہ کے جانشینوں میں محمود شاہ، احمد شاہ رابع، علاء الدین، ولی اللہ اور کلیم اللہ کا زمانہ بڑا ہی پُر آشوب رہا ہے۔ محمود شاہ نے گو چھبیس سال تک حکومت کی لیکن آپسی نا چاقی اور دکنیوں اور آفاقیوں کے جھگڑوں نے سلطنت کی چول چول ڈھیلی کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہمنی دور کے صوبے داروں نے ایک کے بعد ایک خود مختاری کا اعلان کردیا اور بہمنی سلطنت پانچ سلطنتوں میں بٹ گئی۔ اور یہ عظیم سلطنت 1350ء میں قائم ہوئی تھی۔ 1525ء میں ختم ہوگئی۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU
IMC LIBRARY
* Hyderabad-34.

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فیروز شاہ بہمنی کے دور میں اردو زبان و ادب میں جو کام ہوا اس پر روشنی ڈالیے۔
2. احمد شاہ بہمنی کے دور سے بہمنی سلطنت کے ختم ہونے تک کے واقعات و حالات بیان کیجیے۔

8.5 بہمنی دور کے علمی اور ادبی کارنامے

اب تک کی تحقیق کے مطابق دکنی اردو کی قدیم ترین مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے۔ ایک زمانے تک ''معراج العاشقین'' کو اردو کی پہلی تصنیف سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے منسوب کی جاتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ''معراج العاشقین کا مصنف'' کے عنوان سے جو کتاب لکھی ہے اس میں مدلل انداز میں انھوں نے ثابت کردیا ہے کہ ''معراج العاشقین'' نہ تو حضرت گیسودراز کی تصنیف ہے نہ ان کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ بلکہ ان کے زمانے کے تقریباً دوسو سال کے بعد مخدوم شاہ حسینی نے اس کو لکھا ہے۔ اور اس طرح ''معراج العاشقین'' کو اردوئے قدیم یا دکنی کی پہلی تصنیف نہیں کہا جاسکتا۔

مذکورہ تحقیق کے بعد فخر دین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اردو کی قدیم ترین تصنیف قرار پاتی ہے۔ یہ مثنوی احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں لکھی گئی ہے۔

احمد شاہ کا زمانہ 825 - 838 ھ م 1421 - 1434 ء رہا ہے۔ احمد شاہ کے دور کی تصنیف ہونے کی داخلی شہادت خود مثنوی میں موجود ہے۔ نظامی نے لکھا ہے:

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار — پرت پال سینسار' کردار ادھار
دھنیں تاج کا کون راجا ابھنگ — کنور شاہ کا شاہ احمد بجھنگ

مثنوی میں بار بار مصنف نے اپنا نام ''فخر دین نظامی'' لکھا ہے۔ مثنوی کا نام کیا تھا اس کا پتا نہیں چلتا کیوں کہ ابتدائی ورق اور بیچ کے کئی اوراق کے علاوہ آخر کے حصے میں اس مثنوی کا نام نہیں ملتا۔ چونکہ مثنوی کی کہانی کدم راؤ اور پدم راؤ کے کرداروں پر استوار ہوئی ہے۔ اس لیے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اس مثنوی کا نام کدم راؤ پدم راؤ رکھ دیا ہے۔ بعد میں جمیل جالبی نے اسے مرتب کیا اور اسی نام سے شائع بھی کردیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا قصہ کسی مشہور ہندوستانی کہانی سے ماخوذ ہے۔ اس مثنوی کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ کدم راؤ راجہ ہے اور اس کا وزیر پدم راؤ ہے۔ کدم راؤ ایک دن اعلیٰ ذات کی ناگنی کو ایک کم ذات کے سانپ کے ساتھ میل کھاتا دیکھ لیتا ہے۔ وہ کم ذات کے سانپ کو فوراً ہی تہہ تیغ کردیتا ہے اور ناگنی کو بھی مارتا ہے لیکن اس کی دم کٹ جاتی ہے اور وہ جھاڑیوں میں چھپ جاتی ہے۔ راجہ کدم راؤ کو عورت کی بے وفائی کا یقین ہوجاتا ہے اور وہ اداس رہنے لگتا ہے۔ رانی سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ پدم راؤ وزیر بھی سمجھاتا ہے لیکن کدم راؤ دنیا سے بیزار ہوکر جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں رہنے لگتا ہے۔ وہ اکھرناتھ نامی جوگی سے بے حد متاثر ہوتا ہے' کیونکہ وہ کسی بھی چیز کو کسی بھی دوسری چیز میں تبدیل کرنے کا گُر جانتا تھا۔ وہ اپنے اس کمال سے راجہ کو چڑیا بنادیتا ہے اور خود راجہ بن بیٹھتا ہے۔ ایک دن وہ پدم راؤ سے ایک ''فرمائش نامعقول'' کرتا ہے۔ جب پدم راؤ اسے پورا کرنے سے انکار کردیتا ہے تو اس پر بہت برہم ہوتا ہے تو ادھر کدم راؤ چڑیا کے روپ میں اڑتے اڑتے اپنے محل پہنچتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اصل وہی کدم راؤ ہے۔ پچھلی باتیں جب وہ سناتا ہے تو پدم راؤ کو یقین ہوجاتا ہے کہ وہی کدم راؤ راجہ ہے۔ پدم راؤ موقع پاکر جب اکھرناتھ گہری نیند میں رہتا ہے اسے ختم کردیتا ہے۔ کدم راؤ منتر کے زور سے پھر اپنی اصلی حالت میں آجاتا ہے اور محل میں واپس آکر ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔

مثنوی ''کدم راؤ اور پدم راؤ'' کی زبان بے حد مشکل ہے اور اس کو سمجھنا بھی بہت مشکل ہے ۔ اس مثنوی کی قدامت کے باوجود اس میں جو خوبیاں ملتی ہیں اس کے تعلق سے جمیل جالبی لکھتے ہیں :

''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' ساڑھے پانچ سو سال سے زیادہ پرانی مثنوی ہے اور اردو ادب کے اولین روایت کی نمائندہ ہے۔ جس کثرت سے اس میں ضرب الامثال اور محاورے استعمال ہوئے ہیں۔ وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ زبان صدیوں پرانی ہے جو سینکڑوں سال کی مسافت طے کر کے' اپنے ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزر کر ادبی سطح پر استعمال میں آنے کے لائق بنی ہے ۔ سنسکرتی الفاظ کے استعمال کے علاوہ جہاں تک بیان کی چستی اور رچاوٹ کا تعلق ہے وہ ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں موجود ہے۔ یہاں بیان میں بے جا پھیلاؤ کا بھی احساس نہیں ہوتا بلکہ بات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کا عمل ملتا ہے ۔ مثنوی میں استعمال ہونے والی ضرب الامثال میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو آج بھی اردو زبان کے سرمائے میں شامل نہ ہو''۔

(تاریخ ادب اردو صفحہ 166)

8.6 میراں جی شمس العشاق

میراں جی عین جوانی میں دنیوی تعلقات ترک کر کے راہ خدا میں نکل گئے تھے ۔ وہ بیت اللہ میں قیام کے بعد مدینہ منورہ میں کوئی بارہ سال رہے ۔ وہ ایسے خاندان کے بانی تھے جس نے صدیوں تک ارض دکن میں رشد و ہدایت کا کام انجام دیا۔ میراں جی کا زمانہ 1496ء کا ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بہمنی سلطنت طوائف الملکی کی شکار ہو چکی تھی ۔ وہ رو بہ زوال تھی ۔ 1490ء میں عادل شاہی حکومت اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر چکی تھی ۔ بیدر کی برید شاہی 1487ء سلطنت بھی آزادی کا اعلان کر چکی تھی ۔ برار میں عماد شاہی (1487ء) حکومت بھی قائم ہو چکی تھی ۔ احمد نگر کی نظام شاہی (1490ء) سلطنت بھی الگ ہو گئی تھی ۔ قطب شاہی سلطنت نے البتہ (1512ء) میں خود مختاری کا اعلان کیا ۔ ان حالت میں ہر طرف بے اطمینانی تھی ۔ میراں جی کی تصانیف اسی زمانے میں سامنے آئیں اور اللہ کی طرف رجوع ہو کر سکون پانے کا طریقہ بتاتی رہیں ۔ اسی وجہ سے ان کی تمام تصانیف کا موضوع تصوف اور اخلاقی تعلیم ہے ۔ ان کی چار کتابیں ملتی ہیں (1) خوش نامہ (2) خوش نغز (3) شہادت التحقیق (4) مغز مرغوب ۔

''خوش نامہ'' ایک سو ستر اشعار پر مشتمل نظم ہے ۔ اس میں ایک نیک سیرت لڑکی ''خوش'' کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کی بہترین صفات کی وجہ سے سب ہی اس سے محبت کرتے تھے اور عزت بھی کرتے تھے ۔ لیکن وہ صرف سترہ سال کی ہوئی تھی کہ اللہ نے اس کو اپنے پاس بلالیا۔ اتنی کم عمری میں خوش کا مرجانا افسوس کی بات ہے لیکن اللہ کی مرضی یہی تھی ۔ اس کی موت سے میراں جی اخلاقی نتائج اخذ کر کے روحانی مسائل کی تشریح کرتے ہیں ۔

دوسری نظم ''خوش نغز'' ہے ۔ یہ صرف بہتر (72) اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس میں سوال اور جواب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے ۔ خوش' مختلف روحانی اور مذہبی مسائل پر سوالات کرتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے ہیں جیسے عقل اور عشق' کرامات' مراقبہ' عرفان روح وغیرہ۔ میراں جی کی نظموں میں مختلف بولیوں جیسے برج بھاشا' پنجابی اور مراٹھی کے اثرات ملتے ہیں ۔

''شہادت التحقیق'' میراں جی کی ایک طویل نظم ہے جو پانچ سو تر سٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں شریعت اور طریقت کے مسائل قرآن اور حدیث کے ذریعے سمجھائے گئے ہیں ۔ اس میں بھی سوال اور جواب کا طریقہ اپنایا گیا ہے ۔ ''طالب'' سوال کرتا ہے ''مرشد'' جواب دیتے ہیں ۔ اس میں بھی شریعت اور طریقت کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ سوچ سمجھ کر شریعت اور طریقت پر چلنا چاہیے جو ایسا نہیں کرتے وہ اپنی عمر ضائع کرتے ہیں ۔

''ہور پھوکٹ عمر کھووے''

مغز مرغوب شمس العشاق کی چوتھی اور آخری نظم ہے ۔ اس میں بھی فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

میراں جی کی زبان مشکل ہے اور اس کو سمجھنے میں وقت پیش آتی ہے ۔ اردو زبان کی خدمت میراں جی اور ان سے پہلے اور بعد کے ادیبوں نے جس طرح کی ہے ۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں :

''یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کھودا جارہا ہے اور ہزار دشواریوں سے راستہ بنایا جارہا ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے زبان کے دریا کو بیان کے راستے پر ڈالا ۔ آج وہ ہمیں مشکل' ناموس اور بے معنی نظر آتے ہیں ۔۔۔۔ اگر یہ لوگ اس دور میں زبان و بیان کے نئے نئے تجربے (اور یہ سب حقیقت میں تجربے ہیں) نہ کرتے تو سرسوتی کی طرح اس زبان کا دریا بھی راستے ہی میں خشک ہوجاتا ۔۔ یہ اردو زبان کے وہ نمونے ہیں جو نویں صدی ہجری کی زبان پر نہ صرف روشنی ڈالتے ہیں بلکہ نقوش راہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہم اس سرمائے سے مختلف تہذیبی دھاروں اور اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کس کس اثر نے ہماری فکر' ہمارے اظہار کو متاثر کیا ہے اور وہ کون سے اثرات تھے جو اُٹھے' بڑھے اور غالب ہوگئے ۔ جس طرح کسی جہاز کی پرواز کو بہت دور تک دیکھنے کے لیے اسے مسلسل ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا پڑتا ہے' اسی طرح اردو کی روایت کو دور تک دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ان لوگوں کی زبان و بیان کی پرواز کو بھی مسلسل دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے''۔ (تاریخ ادب اردو ' صفحہ 174)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. میراں جی شمس العشاق کی تصانیف کا موضوع کیا ہے؟
2. میراں جی شمس العشاق نے کتنی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں ؟

8.7 سید اشرف شاہ بیابانی

سید شاہ اشرف بیابانی (1459ء تا 1528ء) رفاعی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔انھوں نے ''نوسر ہار'' کے نام سے 1503ء میں ایک مثنوی لکھی ۔ اس مثنوی کا نام ''نوسر ہار'' اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں نو باب ہیں اور جو ہار کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہر ہار گویا ہیروں کا ہے۔ ادبی لحاظ سے بھی یہ مثنوی بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ اشرف نے فخر یہ طور پر کہا ہے کہ اس مثنوی میں اس نے ہیرے موتی جڑے ہیں۔ ان کو سونے کے تار میں پرویا ہے ۔ ہر ہر مصرعے میں نگینے جڑے ہوئے ہیں ۔ اس مثنوی کے نو باب نہیں ہیں بلکہ ''نوسر ہار'' ہیں جن کی قیمت ہزاروں اور لاکھوں ہے :

سونے کی جیو کھونٹی گھڑ	ہیرے مانک موتی جڑ
ایک ایک بول مانک مول	سیم ترازو سیں تھیں تول
بند پرائی سونے تار	سچیں ہوا او ''نوسرہار''
ہر ہر مصرعے باندے لڑ	رتن پدارت مانک جڑ
اے نوبا باں نو سرہار	قیمت اس کی لاکھ ہزار

مثنوی کا موضوع واقعہ کربلا یعنی شہادت حسین ہے جس کو ہندوی زبان میں لکھا گیا ہے ۔

بازاں کیتا ہندوی میں قصۂ مقتل شاہ حسین

ہر باب کا عنوان فارسی میں ہے۔ یہ مثنوی شاید مجلسوں میں سنانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کی زبان بہت بامحاورہ ہے۔ جو محاورے اس مثنوی میں ملتے ہیں وہ آج بھی ہماری زبان کا جزو ہیں جیسے وقت آنا (موت آنا)، اٹھ جانا (مرجانا)، غم کھانا (فکر و تردود میں مبتلا رہا) ہات آنا (حاصل ہونا) ہات ملنا (افسوس کرنا) پھل پانا (اچھا نتیجہ حاصل ہونا) آسماں ٹوٹ پڑنا (سخت مصیبت پڑنا) قول کرنا (وعدہ کرنا) وغیرہ۔ اشرف کی اس مثنوی میں رزمیہ انداز بھی ملتا ہے۔ میدان جنگ کا نقشہ بھی اس نے اچھی طرح کھینچا ہے۔ اسی طرح جذبات اور احساس کی پیش کشی بھی بہت اچھی ہے۔ یہ مثنوی اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے جب اردو زبان ابتدائی شکل میں تھی۔ اس زبان کو اردو ہی نہیں بلکہ دکھنی کے نام سے بھی ابھی پکارا نہیں گیا تھا۔ جمیل جالبی کے کہنے کے مطابق:

> ''میراں جی کی طرح اشرفؔ بھی اپنی زبان کو ہندوی کہتا ہے۔ شاہ باجن بھی اپنی زبان کو ہندی یا دہلوی کہتے ہیں۔ ابھی اس کے لیے ''گجری'' یا ''دکنی'' کا لفظ استعمال نہیں ہوا''۔ (تاریخ ادب اردو، صفحہ 178)

بہمنی دور نے اردو کی سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ اس زبان کو دکن کے چپے چپے تک پہنچا دیا۔ بہمنی سلطنت ایک عظیم سلطنت تھی جب یہ ٹوٹی تو پانچ بڑی بڑی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ بہمنیوں نے ایک مشترکہ زبان اور ایک مشترکہ تہذیب آنے والوں کو دی۔ جس سے وہ اپنی الگ شناخت اور پہچان بنا سکے۔ بہمنی دور ہی میں زبان و بیان کو اتنا نکھار اور سنوار دیا گیا تھا کہ وہ ادبی اغراض کیلئے استعمال ہو سکے اور اس میں ہر قسم کے موضوعات بیان ہو سکیں۔ بہمنی دور کے مصنفین نے اردو زبان کی خدمت جس طرح کی ہے اس پر جمیل جالبی یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اردو زبان کے مزاج و خون میں شامل کر کے اسے آگے بڑھایا ہے۔ اگر یہ لوگ ایسا نہ کرتے اور اس زبان کو اپنے اپنے انداز میں، اپنی اپنی ضرورت کے مطابق، استعمال نہ کرتے تو یہ زبان وقت کی قبر میں کبھی کی دفن ہو چکی ہوتی۔ طویل نظم لکھنا، اور وہ بھی ایسے دور میں جب خود زبان و بیان ہر سطح پر گھٹنوں پر چل رہی تھی۔ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان لوگوں نے زبان کو مختلف موضوعات سے آشنا کر کے اسے جلد ہی کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ قدیم اردو مصنفین کا ہم پر یہی احسان ہے۔'' (تاریخ ادب اردو، جلد 5، 179)

بہمنی عہد جب ختم ہوا تو پانچ سلطنتوں میں بٹ گیا لیکن بہمنی دور نے ایسی مضبوط لسانی اور تہذیبی روایت قائم کی تھی جس پر یہ تمام ریاستیں تادم آخر چلتی رہیں۔ ان میں سے عادل شاہی اور قطب شاہی دور ادبی لحاظ سے بھی پر شکوہ اور شاندار رہا ہے جس پر اردو زبان ادب جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ یہ اردو ادب و تہذیب کا بھی سنہری دور ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نوسر ہار پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. بہمنی دور نے اردو کی سب سے بڑی کیا خدمت انجام دی؟ بیان کیجیے۔

8.8 دیگر شعرا

بہمنی دور کے دیگر شعرا میں فیروزؔ، لطفیؔ اور مشتاقؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

فیروز بیدریؔ

فیروز کا پورا نام قطب دین قادری اور تخلص فیروز ہے۔ وہ بیدر کا متوطن تھا جیسا کہ اس نے درج ذیل شعر میں اپنے نام تخلص اور وطن

کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مجھے ناؤں ہے قطب دیں قادری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

فیروز نے ایک مثنوی ''پرت نامہ'' جس کا دوسرا نام ''توصیف نامہ میراں محی الدین'' بھی ہے کے علاوہ چند غزلیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ''پرت نامہ'' کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مرتب کر کے شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے مجلّہ ''قدیم اردو'' (جلد اول) 1965ء میں شائع کر دیا ہے۔

''پرت نامہ'' فیروز نے اپنے پیر و مرشد اور مذہبی رہنما حضرت مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم (متوفی 1564ء) کی مدح میں لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے میں نے خواب میں حضرت غوث اعظم دستگیر کو دیکھا اور جب نیند سے بیدار ہوا تو میرے سامنے حضرت مخدوم جی انھیں کے ہم شکل دکھائی دیے۔ اسی لیے وہ اپنے مرشد کو محی الدین ثانی بھی کہتا ہے۔ ''پرت نامہ'' از اول تا آخر حضرت غوث اعظم اور فیروز کے مرشد حضرت مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم کی مدح و توصیف میں ہے۔

مخدوم جی اپنے دور کے ایک مشہور عالم تھے۔ ان کی شہرت دکن کے علاقے میں بہت جلد پھیل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ گولکنڈے کے تیسرے حکمران ابراہیم قطب شاہ نے انھیں گولکنڈہ آنے کی دعوت دی تھی۔ مخدوم جی خود تو گولکنڈہ نہیں آئے لیکن اپنے مرید فیروز کو اپنی بجائے گولکنڈہ روانہ کیا۔ جہاں فیروز کو بحیثیت شاعر غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ گولکنڈے کے شعرا وجہی، محمد قلی اور ابن نشاطی نے اپنے کلام میں فیروز کا ذکر عزت و احترام سے کیا ہے۔ فیروز کی گولکنڈہ میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ ولی کا سفر دہلی۔ ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

> ''گولکنڈہ میں فیروز کو ایک باکمال شاعر اور استاد سخن کی حیثیت سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ گولکنڈہ کے نوعمر شاعروں نے فیروز کے آگے زانوے ادب تہہ کیا۔ گولکنڈہ میں اردو شاعری کی شمع روشن کرنے کا سہرا فیروز ہی کے سر ہے۔ (دکنی غزل کی نشوونما ص 54)

ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنی کتاب ''دکنی غزل کی نشوونما'' میں فیروز کی 5 نو دریافت غزلیں یکجا کی ہیں۔ اس کی غزل گوئی کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> ''فیروز کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی اور روانی ہے۔ اس کا تصور محبوب مادی اور مجازی ہے اور وہ غزل کو عورتوں سے باتیں کرنے اور عورتوں کی باتیں کرنے کا ذریعہ اظہار سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں محبوب کی جنس واضح ہے۔ وہ اپنے محبوب کو نار، سودھن، استری، شہپری، سانولی، سکھی کے نام سے یاد کرتا ہے۔'' (دکنی غزل کی نشوونما۔ ص 60)

نمونہ کلام:

سنگار بن کا سرو ہے سو قد ترا اسے شہ پری
مکھ پھول تے نازک دسے توں پھول ہے یا استری
سودھن کہے فیروز یا ایسے دیوانہ کی کیا
جب سانولی سکھی سوں مائل ہوا دھن میں
اول کس چھند سوں آ کر نہ تھا سوئیہہ منج لاکر
برہ کے بس منے بھاکر تو بیزاری نہ کرتا تھا

مشتاق بیدری

مشتاق کا پورا نام اور اس کے واقعاتِ حیات پردہ' گمنامی میں ہیں۔ اس کی چند غزلوں اور ایک قصیدے کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''مشتاق سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی (متوفی 1482ء) کے آخری زمانہ کا ایک شاعر تھا جس نے غالباً سلطان محمود شاہ بہمنی (متوفی 1518ء) کے دور میں شہرت حاصل کی اس نے سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ بت شکن کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا وہ اب تک محفوظ ہے۔'' (دکنی ادب کی تاریخ ص 15)

ڈاکٹر زور نے ''دکنی ادب کی تاریخ'' میں مشتاق کی دو غزلوں کے چند اشعار نمونتاً پیش کیے ہیں مولوی نصیر الدین ہاشمی نے بھی ''دکن میں اردو'' میں مشتاق کی غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار درج کیے ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی سخاوت مرزا نے اپنے ایک تحقیقی مضمون ''قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض'' مشمولہ رسالہ اردو کراچی (اکتوبر 1950ء) میں مشتاق کا ایک قصیدہ اور غزلیں شائع کی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ مشتاق ایک باکمال غزل گو اور بے مثال قصیدہ گو بھی تھا۔

نمونہ کلام:

او کسوت کیسری کر تن چمن میانے چلی ہے آ
رہے کھلنے کوں تیوں دستی او چنپے کی کلی ہے آ

صفا اس گال کوں دیکھت نظر سوجا گاگر پڑتی
مکھی کے پر میں کاں طاقت جو سورج لگ جاگزر آوے

لطفی

مشتاق کی طرح لطفی کا پورا نام اور اس کے حالات زندگی نامعلوم ہیں۔

''لطفی بھی اسی (بہمنی) دور کا شاعر تھا اور مشتاق کا ہم عصر۔ اس نے بھی مشتاق کی طرح شاہ محمد کی مدح کی ہے جو خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں تھے۔'' (دکنی ادب کی تاریخ ص 16)

لطفی کی اب تک صرف ایک ہی غزل کے چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں جنہیں ڈاکٹر زور نے ''دکنی ادب کی تاریخ'' میں نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' میں درج کیا ہیں۔ یہ غزل دراصل ریختی ہے جس میں لطفی نے خود کو عورت تصور کر کے عورتوں کے جذبات کی ترجمانی انھیں کی زبان میں کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

خلوت منے سجن کے میں موم کی بتی ہوں
یک پاؤں پر کھڑی ہوں جلنے پرت تپی ہوں

شہہ کے ملن کی ماتی ہر نس جلن کوں آتی
سب قد کھرا جلاتی پن آہ نئیں کتی ہوں

رسیا چتر رسیلے بھوگی سو شاہ محمد
مندر منے سجن کے نس جاگتی رہتی ہوں

مشتاق اور لطفی کی غزل گوئی کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں :

''مشتاق اور لطفی کے کلام کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ وہ اپنے زمانے کے اساتذہ سخن رہے ہوں گے ۔۔۔ یہ قدیم اردو غزل کے اولین نمونے نہیں ہوسکتے بلکہ ان کے پیش روشعرا نے بھی صنف غزل پر طبع آزمائی کی ہوگی ورنہ غزل کے ان اولین نقوش میں اس درجہ پختگی اور روانی پیدا نہیں ہوسکتی تھی ۔'' (دکنی غزل کی نشو ونما ص 51)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فیروز نے کن اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ؟
2. فیروز کی مثنوی کا نام بتایئے ۔
3. مشتاق نے غزل کے علاوہ کس صنف میں طبع آزمائی کی ؟
4. لطفی کی کتنی غزلیں دریافت ہوئی ہیں ؟

8.9 خلاصہ

اردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی ۔لیکن دکن میں وہ نہ صرف پلی بڑھی بلکہ ادبی اغراض کے لیے استعمال ہونے لگی ۔ شمال سے دکن وہ سیاسی وجوہات کی بنا پر پہنچی ۔ امیر خسرو نے اسے ہندی یا ہندوی کہا۔ دہلی میں وہ ''زبان دہلوی'' کہلائی ۔ علاء الدین خلجی نے دکن کا پورا علاقہ فتح کرلیا۔ جس میں گجرات اور مالوہ بھی شامل تھے ۔ اس پورے علاقے کو اس نے ایک سو علاقوں میں تقسیم کردیا۔ اور ہر حصہ پر اپنا ایک امیر یا حاکم مقرر کیا جس کو وہ ''امیر صدہ'' کہتے تھے ۔ امیرانِ صدہ نے دکن ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا ۔ وہ اپنے تمام متعلقین کے ساتھ دکن آئے ۔ امیران صدہ کے نظام کو بعد میں تغلق نے بھی قائم رکھا۔ تغلق نے جب پائے تخت دہلی کی بجائے دولت آباد منتقل کیا تو دہلی کی ساری آبادی دکن منتقل ہوگئی۔ لیکن جب دوبارہ دہلی کو پائے تخت بنایا گیا تو بے شمار لوگ دکن ہی میں رہ گئے ۔ اردو پہلے گجرات پہنچی اور گجری کہلائی' بعد میں دکن پہنچی تو دکنی کہلائی ۔ مذکورہ بالا سیاسی حالات کی وجہ سے اردو کو دکن میں پھلنے پھولنے کا زبردست موقع مل گیا۔ بعد میں جب تغلق کی حکومت کمزور پڑ گئی تو امیرانِ صدہ نے متحدہ طور پر بغاوت کردی۔ اور اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔ اس نئی سلطنت کا بانی علاء الدین شاہ بہمن تھا ۔ اسی مناسبت سے 1347ء میں عظیم الشان بہمنی سلطنت قائم ہوئی ۔ چونکہ ہر سلطنت جب آزاد ہوتی ہے تو ہر بات میں اپنی شناخت بناتی ہے اسی طرح بہمنی سلطنت نے بھی ہر بات میں شمالی ہند سے الگ طور پر اپنی شناخت قائم کی۔ لسانی طور پر بھی چونکہ شمالی ہند میں فارسی کا بول بالا تھا اس لیے اور پھر اس وجہ سے بھی کہ ان کے رابطے کی زبان شروع ہی سے اردو تھی انھوں نے اردو ہی کو اپنایا' اور ہر ممکن طرح سے اردو کی سرپرستی کی۔ بڑی مدت تک اردو کو اردو نہیں کہا گیا۔ وہ ہندی اور ہندوی کہلاتی تھی ۔ بعد میں وہ ''دکنی'' کہلائی۔

اردو کی ترویج و اشاعت میں صوفیائے کرام کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ دکن میں بھی کئی صوفیا آئے جنھوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی انھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی رشد و ہدایت کے لیے استعمال کیا۔ بہمنی سلاطین بھی ان صوفیا کا بڑا احترام کرتے تھے ۔ یہ بزرگان دین عوام ہی کی رہنمائی نہیں کرے تھے بلکہ خود بادشاہوں کو بھی راہ راست پر لاتے تھے۔ پروفیسر عبدالقادر سہروردی نے لکھا ہے کہ حضرت زین الدین نے محمد شاہ بہمنی کو تلقین کی کہ وہ مئے نوشی ترک کردے تو اس نے نہ صرف خود شراب پینا چھوڑ دیا بلکہ حدود سلطنت میں مئے نوشی ممنوع قرار دے دی۔ فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو بھی دکن تشریف لائے ۔ ان بزرگان دیں کی وجہ سے بھی دکنی اردو کی ترویج ہوئی ۔ وہ فارسی کے ساتھ اردو میں بھی رشد و ہدایت کا کام انجام دیا کرتے تھے ۔ اس کے ساتھ دکنی میں ہی تصنیف و تالیف بھی کیا کرتے تھے ۔ بہمنی عہد کوئی دو سال سال تک چلتا رہا۔ اس پورے دور میں دکنی اردو ہی رابطے کی زبان تھی ۔ اور علمی ادبی اور مذہبی

اغراض کے لیے دکنی ہی استعمال کی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف شمالی ہند میں ہر سطح پر فارسی ہی کا بول بالا رہا۔ حد یہ کہ اردو کے شاعر جب اردو ہی کے شاعروں کا ''تذکرہ'' لکھتے ہیں تو فارسی میں لکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے لیے اردو صرف بول چال کی زبان تھی وہ اردو کی اس سطح کو بلند نہیں کر پار ہے تھے لیکن دکنی ادیبوں اور شاعروں نے ہر قسم کے علمی اور ادبی کاموں کے لیے اردو کو استعمال کیا۔ اور یہ کام سب سے پہلے بہمنی دور میں ہوا۔ بہمنی دور نے دکنی اردو کو ایسی مضبوط بنیادیں فراہم کردیں تھیں جس پر بعد کی ریاستیں خاص طور پر عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتیں دکنی ادب کی عالی شان اور پائیدار عمارتیں بنا سکے۔ 1525ء میں جب عظیم الشان بہمنی سلطنت ختم ہوئی اور پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں تو ان سب میں دکنی کو پھلنے پھولنے اور ممکنہ ترقی پانے کا موقع ملا۔

بہمنی سلطنت میں دکنی زبان کو علمی اور ادبی اغراض کے لیے جس کمال کے ساتھ استعمال کیا وہ بہمنی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں پوری شان اور آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ دکنی کا موجودہ تحقیق کی بنا پر قدیم ترین شاعر فخر دین نظامی ہے۔ اس کی مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ ساری دنیا میں ملتا ہے۔ یہ نسخہ بھی بہت ہی خستہ حالت میں ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ بھی چونکہ تلف ہوگیا ہے اس لیے مثنوی کا نام کیا تھا یہ معلوم نہیں ہوتا۔ مثنوی کے دو اہم کردار کدم راؤ اور پدم راؤ ہیں۔ اسی وجہ سے مثنوی کے مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسے مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا نام دیا ہے۔ اس مثنوی کی زبان کو سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ اس مثنوی میں کسی مشہور اور مقبول ہندوستانی قصے کو پیش کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں جب کہ زبان ابتدائی حالت میں تھی اتنی طویل مثنوی لکھنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ادبی اغراض کے لیے بھی یہ زبان کافی مدت سے استعمال ہو رہی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس مثنوی کا لکھنے والا قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے جو محاورے استعمال کیے ہیں ان سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ بہرحال یہ مثنوی دکنی ادب کا قدیم ترین اور قابل قدر نمونہ ہے۔

میراں جی شمس العشاق بہمنی عہد کے ایک اہم شاعر اور بزرگ ہیں۔ ان کی چار کتابیں ملتی ہیں: (1) خوش نامہ (2) خوش نغز (3) شہادت التحقیق (4) مغز مرغوب

''خوش نامہ'' میں ایک 17 سالہ لڑکی جو حد درجہ نیک اور پاکیزہ صفات رکھتی تھی، وہ نوعمری میں اللہ کو پیاری ہوجاتی ہے۔ اس کی موت سے میراں جی نے اصلاحی نتائج اخذ کیے ہیں اور روحانی مسائل کی تشریح کی ہے۔

دوسری نظم ''خوش نغز'' ہے۔ یہ 72 اشعار والی مختصر نظم سوال اور جواب کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم کا مرکزی کردار ''خوش'' ہے۔ وہ میراں جی سے روحانی مسائل کے بارے میں سوالات کرتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے ہیں۔ تیسری نظم ''شہادت التحقیق'' ہے یہ ایک طویل نظم ہے جو پانچ سو ترسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں شریعت اور طریقت کے مسائل، قرآن شریف اور احادیث کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں بھی سوال و جواب کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ طالب سوال کرتا ہے اور مرشد جواب دیتے ہیں۔ سوال بھی تفصیلی ہیں اور جواب بھی۔ میراں جی کی ایک اور مختصر نظم ''مغز مرغوب'' ہے۔ اس میں صوفیانہ اور فلسفیانہ مسائل کی تشریح کی گئی ہے۔ میراں جی کی زبان قدیم ہونے کی وجہ سے بہت مشکل معلوم ہوتی ہے۔

سید شاہ اشرف بیابانی، میراں جی شمس العشاق کے کم عمر ہم عصر ہیں۔ جنہوں نے ''نوسرہار'' کے نام سے ایک مثنوی یادگار چھوڑی ہے۔ ''نوسرہار'' میں ''واقعہ کربلا'' یعنی شہادت حضرت امام حسینؓ کو پیش کیا گیا ہے چونکہ مثنوی کے نو باب ہیں اس لیے اسے ''نوسرہار'' کہا گیا ہے۔ اس کی زبان بامحاورہ ہے۔ اس میں لازم کی کیفیت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ جذبات و احساسات کی عکاسی بھی اچھی کی گئی ہے۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے ادبی لحاظ سے بھی یہ مثنوی اچھی ہے۔

اس دور کے دیگر شعرا میں فیروز بیدردی، لطفی اور مشتاق کے نام قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے ایک مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ چند غزلیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور آخرالذکر شاعروں کے چند غزلیں اور قصائد ملتے ہیں۔

بہمنی دور، اردو ادب کی تاریخ میں اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اسی عہد میں دکنی زبان و ادب کو ایسی مستحکم بنیادیں فراہم ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے بعد میں بھی ان بنیادوں پر اردو شعر و ادب کی شاندار عمارتیں کھڑی کی گئیں۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * IMC LIBRARY * Hyderabad-34

8.10 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے تیس تیس سطروں میں جواب لکھیے ۔

1. وہ کون سے سیاسی اور تاریخی حالات ہیں جن کی وجہ سے اردو شمال سے دکن آئی ؟
2. بہمنی دور کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیے ۔

درج ذیل سوالوں کے پندرہ پندرہ سطروں میں جواب لکھیے ۔

1. نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ۔ بیان کیجیے ۔
2. میراں جی شمس العشاق کی تصانیف کا جائزہ لیجیے۔
3. ''نوسرہار'' کا تنقیدی جائزہ لیجیے ۔
4. ''اردو'' کے علاوہ اردو زبان کے اور کون سے نام ملتے ہیں ۔
5. بہمنی بادشاہوں کے عہد میں علم و ادب کی جو سرپرستی ہوئی اس پر روشنی ڈالیے ۔

8.11 فرہنگ

ریختہ = ریختن کے معنی ٹپکانا، ملنا، اردو کو ریختہ اس لیے کہا گیا کہ دوسری زبانوں کے الفاظ اس میں ملے ہوتے ہیں۔

رزم = جنگ و جدل رزمیہ، ایسی شاعری جس میں جنگ و جدل کے حالات و واقعات ہوں

طریقت = باطنی طور پر نیکی کے اصولوں کو اپنانا۔ بے ریائی کے ساتھ نیک عمل اور اصولوں پر کاربند رہنا۔

مبتدی = شروع کرنے والا، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والا

ملفوظات	=	کہے ہوئے الفاظ، بولی ہوئی بات، ارشادات	اردوئے معلّٰی	=	شاہی لشکر، اعلٰی اردو زباں
رشد	=	راہ راستی کی تعلیم، ہدایت	شریعت	=	اسلامی اصول و قوانین
اردو	=	لشکر، چھاؤنی، بازار	قماربازی	=	جوا کھیلنا
پلیتی	=	گندگی			

8.12 سفارش کردہ کتابیں

1.	اردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبدالقادر سہروردی	1958 ء حیدرآباد
2.	داستانِ ادبِ اردو	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	1982 ء حیدرآباد
3.	مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو	ڈاکٹر مسعود احسن خاں	1978 ء حیدرآباد
4.	تاریخِ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی	1993 ء دہلی
5.	دکنی غزل کی نشو ونما	ڈاکٹر محمد علی اثر	1986 ء حیدرآباد